© rasailojaraid.com

تاریخ سے انٹرویو

تاریخ کہتی ہے ''وہ ایک عظیم شخص تھا''

وہ عرب ایک سترہ سالہ نوجوان تھا! جس کا بچپن رزمیہ شاعری اور جنگ و جدل کے معرکوں کو سنتے گزرا۔ لڑکپن کو اس نے تیغ وسناں سے کھیلتے گزار دیا۔ جیسا کہ عربوں میں یہ خوبیاں زندگی کا لازمہ ہوتی تھیں وہ خوبصورت و دمکتے نورانی چہرے پہ چمکدار ذہانت سے بھری سیاہ آنکھیں رکھتا تھا۔ اس کی کھلی پیشانی اس کی متانت کی لکیروں سے بھرپور تھی۔ اس کے چہرے پہ اک عجیب طمانیت کا وقار اور عزم و یقین کی انوکھی بہار تھی۔ مگر ٹھہریئے! یہ خوبیاں تو ہر تیسرے شخص میں موجود ہوتی ہیں۔ چلیئے ذرا مبالغے سے بھی کام لیا جائے کہا جاسکتا ہے۔ کہ وہ سینکڑوں میں ایک تھا۔ پھر تاریخ کو کیا پڑی ہے کہ وہ اسے عظیم قرار دینے پہ مصر ہے۔

تاریخ کے بوسیدہ اوراق مزید انکشاف کرتے ہیں اسکی قوت و طاقت فولادی تھی۔ کسی چڑھے دریا کے دھارے کی مانند اسکے بازوؤں میں گویا برق دوڑ رہی تھی وہ ایسے آھنی حوصلے کا مالک تھا جو ٹوٹنا نہیں جانتا تھا۔ اس کے پاؤں کے ثبوت میں ارتعاش نہ تھا۔ اس کا دل توانا تھا جذبے سے بھرپور تھا۔ اس کی شجاعت و ہمت دیدنی تھی۔ مگر تاریخ کا طالب علم پھر غیر مطمئن ہوتے ہوئے پکار اٹھتا ہے کہ میں ایسے بیسیوں اشخاص سے واقف ہوں جو خوب روئی کے ساتھ ساتھ رستم زماں تھے۔ مگر تاریخ نے ان سے پہلو تہی کی ہے۔ پھر اسی کیساتھ یہ امتیازانہ سلوک کیوں؟

تاریخ کے بوسیدہ اوراق پہ روشنی کی اک لہر سی اٹھتی ہے گویا وہ طالب علم کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ وہ کہتی ہے۔ وہ بلا کا جنگجو ہی نہ تھا۔ وہ حسن و جمال کا پیکر ہی نہ تھا وہ طاقت کا ناقابل تسخیر لاوا ہی نہ تھا اسکی اتنی ہی خوبی قابل تحسین نہ تھی کہ اس کی آھنی گرفت بیمثال تھی کہ شمشیر زنی میں کوئی اسکے مقابل آئے اور اسے مات دے جائے۔ آسمان نے کبھی یہ منظر تو آج تلک دیکھا ہی نہ تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اس سب کچھ کو جھکا دیا۔ اس نے اپنی تمام تر طاقتوں کو مجتمع کیا، اپنی جوانی کے باغیانہ ولولے کو نچوڑا اور اس سب جمع پونجی کو اپنی پیشانی کا جھومر بنا دیا اور پھر اپنی اس پیشانی کو رب کائنات کے سامنے سرنگوں کر دیا وہ سراپا عجز و نیاز بن گیا اس نے ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے'' کو اپنا ماٹو بنالیا۔

وہ کلام مقدس کو خالص عرب لہجے میں پڑھتا تھا اور اس کی شیرینی سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس کی راتیں اور راتوں کی تنہائیاں ویران گوشوں کو آباد کرتی مصلے پر گزرا کرتی تھیں مگر ذہن کی سلیٹ پہ پھر شکوک کی لہر اٹھتی ہے اور ساحل پہ آکے پلٹنے والی تیز لہر کی مانند سب کچھ بہا کے چلتی بنتی ہے۔ شائد تاریخ نے بھی اس کو محسوس کرلیا۔ وہ بھی تو بڑی زیرک ہے۔ کتنے علم وعمل کے پہاڑ لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا کتنے اعلیٰ دماغوں نے اس کی آغوش میں پرورش پائی۔ پھر اس ننھے دماغ کو کیوں نہ سمجھ پاتی وہ دوبارہ گویا ہوتی ہے اور اب اس کے چہرے پہ بلا کی سنجیدگی ہے۔

وہ کہتی ہے کہ میں نے اسے اتنا بلند مقام اسے اس لئے دیا کہ............ اس نے کہنا شروع کیا۔

وہ اپنی زندگی کے ایام کو روزمرہ معمولات سے گزار رہا تھا۔ اس کی پیشانی پہ راتوں کی تنہائیوں میں سوز و گداز کے سجدوں کا عکس بڑھتا جارہا تھا۔ وہ شمشیر کو انگلیوں میں گھمانے میں کمال حاصل کرتا جارہا تھا۔ یعنی ایک زاہد شب اپنی دنیا میں مگن کہ اچانک اس کی زندگی میں انقلاب اس وقت بپا ہوا جب اچانک ایک دن اس کے چچا نے اسے طلب کرلیا وہ اپنے چچا کی فطرت سے خوب آگاہ تھا۔ وہ اتنا سخت تھا کہ لوگ اسے ظالم گردانتے تھے۔ اس کے رعب وجلال سے اک دنیا لرزاں تھی۔ مگر اس نے دیکھا کہ ایسا چہرہ اس نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ چہرہ تو بھٹی میں جلتے کوئلوں کی مانند دہک رہا تھا۔ شدت اضطرار سے وہ بار بار مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ حزن وملال اس کے انگ انگ سے ٹپک رہا تھا۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات کرنے کی بجائے وہ کسی بے چین روح کی مانند کمرے میں گردش کر رہا تھا۔ وہ اس کی وجوہات ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ اس کے چچا نے چمکتے پھل والا ایک دیوار پہ لٹکتے بوسیدہ نقشے پہ گاڑھ دیا۔ وہ واپس پلٹا نوجوان کو اضطراب کی وجہ تفصیل کے ساتھ بیان کی۔ اس نے بتایا کہ ہم سے کوسوں دور کوئی شخص انسان ہوتے ہوئے بھی خدا بن بیٹھا ہے۔ اس نے طاقت سے کمزوروں کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ اس نے بحری قزاقوں کی ایک فوج پال رکھی ہے۔ جو مسافروں کو لوٹتے ہیں ان کے خون سے اپنی تلو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی پیاس بجھاتے ہیں ۔ مال اسباب کو اپنے گھروں میں ڈال لیتے ہیں ۔اور حوا کی بیٹیوں کی چادر ناموس کو تار تار کردیتے ہیں ۔ایسی ہی ایک حوا کی بیٹی نے کال کوٹھڑی سے آج اسے مدد کیلئے پکارا ہے۔

تاریخ کہتی ہے اس تامل نہیں کیا اس نے اپنی نوخیزی کو نہیں لیا اگر حالات نے شاعرانہ انداز میں یوں پکارا ہو کہ:

"قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے" تو اس نے گویا فوراً اپنے عمل سے جواب دیا:

"جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے"

پھر ویرانے اس کے گھوڑے ٹاپوں سے گونجتے گئے ۔وہ اپنے مختصر سے قافلے کی قیادت کرتا بہت جلد دیبل کے کناروں پہ آ پہنچا۔اس کے سرفروش ایسی بے جگری سے لڑے کہ داہر کی غرق آہن فوج ...... جو ہاتھیوں پہ مقیم تھی۔شکست سے دوچار ہوئی۔

جانتے ہو کہ یہ کون تھا؟

یہ محمد بن قاسم تھا۔

جس کو 712ء میں ایک بہن کی پکار پہ لبیک کہتے ہوئے بھیجا اور سپہ سالاری کی تاریخ میں ایک نادر مثال قائم کردی۔یہیں اس کی جہادی زندگی کی وہ ان مٹ خوبی ہے تاریخ نے اسے نمایاں مقام دیا۔

عزیز بھائیو! آج ایک نہیں کتنے ہی داہر ستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔کتنی ہی بہنوں کے سندیسے ہوا کے دوش پہ ہم سن رہے ہیں۔مگر ہم میں کوئی ابن قاسم دکھائی نہیں دیتا................کیوں؟ خود سوچیئے کہ ٹی وی دیکھنے والی آنکھیں بھلا اس قابل رہیں گی کہ ان میں اسلامی ذہانت کی چمک پیدا ہو۔ باہم دست و گریباں ہمارے ہاتھ اس قابل رہیں گے کہ وہ داہروں کے مقابل تلوار لہرا سکیں۔اخلاق سوز انڈین گانے ہمارے کانوں کو اس قابل رہنے دیں گے کہ ہم قرآن کی پکار کو اپنے اذہان تک پہنچا سکیں۔مظلوموں کی آہ پر کان دھر سکیں۔نہیں میرے بھائیو آج اگر محمد بن قاسم کے کردار کو اٹھانا چاہتے ہو تو ترک کرد یجئے یہ سب کچھ۔بدلنا ہوگا ہمیں اپنے شب و روز کو۔آؤ آج عہد باندھیں کہ اپنے اس ہیرو کی روایات کو پھر سے زندہ کریں گے۔تا کہ دنیا بھر کے راجہ داہر اپنے ظلم و ستم چھوڑ دیں اور رب کی دھرتی پہ اسی کا نظام عمل میں آئے۔انشاءاللہ

بادشاہ خزانے کا مالک نہیں بلکہ امین ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی زوجہ محترمہ کو ان کے والد خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ایک بیش قیمت گوہر دیا تھا۔عمر بن عبدالعزیز جب امیر المومنین ہوئے تو انہوں نے فرمایا اپنا تمام زیور بیت المال میں داخل کردو ۔ وگرنہ میں تم سے الگ ہو جاؤں گا کیونکہ مجھے گوارا نہیں کہ تم اور تمہارے زیور جو رعایا کے روپے سے بنے ہیں اور میں ایک گھر میں رہ سکوں۔ وہ بھی نیک بخت خاتون تھیں اس نے سارا زیور بیت المال میں جمع کردیا۔

عمر بن عبدالعزیز کے بعد جب یزید بن عبدالملک بادشاہ ہوا تو اس نے بھی اپنی بہن یعنی آپ کی زوجہ محترمہ سے کہا آپ چاہیں تو اپنا زیور واپس لے سکتی ہیں۔انہوں نے فرمایا جو چیز اپنی خوشی سے میں نے ان کی حیات میں داخل خزانہ کرچکی ہوں اب ان کے بعد واپس لے کر کیا کروں گی؟

عمر بن عبدالعزیز کے صاحبزادے کہتے ہیں کہ مجھ سے ابو جعفر منصور نے پوچھا تمہارے والد کی کیا آمدنی تھی کہا کل چار سو دینار۔ یہ آمدنی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ اگر وہ اور زندہ رہتے تو اور بھی کم ہو جاتی۔

عمر بن مہاجر (جن کو آپ نے کوتوال شہر مقرر کیا تھا) کہتے ہیں آپ کی تنخواہ دو درہم روزانہ مقرر تھی۔آپ کا چراغ دان تین لکڑیوں کو کھڑا کر کے اس پر مٹی رکھ کر بنایا جاتا تھا۔جب اراکین سلطنت رات کے وقت آپ کے پاس جمع ہوتے تو معاملات سلطنت پہ گفتگو کرتے تو آپ بیت المال کا چراغ جلائے رکھتے جب دربار برخواست ہو جاتا تو اس کو گل کر کے اپنا چراغ جلا لیتے۔

جب آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے گھر کے اخراجات کم کردیئے۔گھر سے شکایت ہوئی آپ نے فرمایا میری تنخواہ میں اس قدر وسعت نہیں ہے کہ تمہارا سابقہ خرچہ جاری رکھوں۔باقی رہا بیت المال اس میں تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا مسلمانوں کا۔

ایک دن بنو مروان یعنی شاہی خاندان کے لوگ آپ کے رشتہ برادری والے آپ کے مکان پر آئے۔آپ کے بیٹے سے ملے اور کہا خلیفہ سے جا کر کہو کہ آپ سے پہلے جس قدر خلفاء ہوئے سب ہمارے لئے عطایات اور جاگیریں مخصوص کرتے رہے ہیں۔آپ نے ہم پر تمام چیزیں حرام کردیں۔کیا بوجہ قربت بھی ہمیں کچھ حق نہیں پہنچتا؟ آپ نے جواب دیا جاگیریں اس لئے بند ہیں اور عطایات اس لئے موقوف ہیں کہ بیت المال میں غریبوں اور امیروں سب کا پیسہ جمع ہے۔تمہیں جاگیریں دے دوں اور روپیہ تمہارے عیش و عشرت کیلئے وظیفوں کی صورت میں بانٹ دوں تو یتیموں بیواؤں، مسکینوں اور حقداروں کو کیا دوں؟ اور خداوند کریم کی نافرمانی کر کے قیامت کے عذاب سے کس طرح نجات حاصل کروں؟ باقی رہا حق قرابت تو میرے نزدیک اس معاملے میں تم اور ایک ادنیٰ مسلمان برابر ہیں۔

© rasailojaraid.com